شرفِ تکلّم

فلاح الدین شمسؔ

شرفِ تکلّم

فلاح الدین شمسؔ

ISBN:978-1-948811-24-8
Publisher: Shams Publications
Date of Publication: December 2025

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
	پیش لفظ۔ پروفیسر مبارک احمد عابد	
	پیش لفظ۔ صفی اللہ خان	
1	حمد	1
3	نعت	2
5	کبھی دیکھو تو	3
6	ترانۂ احمدی	4
8	آمدِ مسیح	5
9	خلافت سو سالہ جوبلی	6
11	تم کہاں جاؤ گے (رومانوی)	7
13	تم کہاں جاؤ گے (سنجیدہ)	8
15	دنیائے امتحاں	9
17	مناجاتِ عشق	10
19	مسجد برازیل کی بنیاد رکھنے پر	11
22	ہستیٔ اسرار	12
24	دنیائے فانی کا سفر	13
26	پتھر سے گھر تک	14
28	ربوہ کی یادیں	15
32	آخری حساب کتاب	16
34	عمر بھر کی تلاش	17

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
18	محبوب کے نام	46
19	ظلم اور احسان	49
20	پردیس	51
21	سورج اور چاند کی جوڑی	52
22	بڑھاپے کے عذاب	54
23	غزلیات	56
24	پنجابی غزل	82

فلاح الدین شمس کی شاعری

شاعری دل کے جذبات کی الفاظ کے آہنگ کے ساتھ تصویر کشی ہے جذبات اور خیالات تو ہر انسان کے دل و دماغ میں موجزن رہتے ہیں۔ لیکن شاعر انہیں الفاظ کو نگینوں کی ترتیب سے منسلک کر کے یوں پیش کرتا ہے کہ قاری یا سامع ان کو پڑھ کر یا سُن کر بقول غالب یہ سمجھتا ہے کہ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے

فلاح الدین شمس کی طبیعت بچپن سے حساس تھی۔ وہ شروع سے احساس کی دولت سے مستفیض ہیں۔ طبیعت میں موزونیت بھی تھی۔ اس لئے شاعری بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور یوں ان کا کلام جذباتِ دل سے آراستہ ہونے لگا۔ ان کی شاعری ان کی حساسیت کا آئینہ ہے۔ نظم ہو یا ان کی غزل اس میں روایت سے بھی وہ ہم آہنگ ہیں۔ اور کہیں کہیں اپنی جدّتِ طبع کے جلوے بھی دکھاتے ہیں دیکھئے

ہوا ہے وصل کا وعدہ مگر نہیں ہے یقین
جو ہوش ہی نہ رہے کیا پتہ سُنا کیا ہے
ہماری سانسوں کو حاجت ہے تیری خوشبو کی
جو تیری زلفوں سے مہکی نہ ہو، ہوا کیا ہے

روایتی طور پر واعظ اور ناصح سے شعراء کی نوک جھوک چلتی رہتی ہے۔ ایک نظم ہے شمس کی واعظ کے نام فرماتے ہیں

نہ زندگی میں کسی دل کو جیت پایا ہے
یہ فخر و زعم ہے کس بات کا، کیا کیا ہے
ہزار وعظ سنے دل پہ کچھ اثر نہ ہوا
تمام دنیا کو چھوڑا تُو ناصحا کیا ہے

ہمارے اس شاعر فلاح الدین شمس نے حمد، نعت اپنی مذہبی عقیدت، خلافت سے وابستگی، احمدیت سے محبّت۔ مسیحائے زماں پر جاں نثاری کے جذبات کو بھی اپنے کلام میں والہانہ انداز میں اجاگر کیا ہے مثال کے طور پر

تھا میرا ظرف کم کہ جو مانگا بہت ہی کم
وہ فضل اپنے مجھ پہ لگاتار کر گیا
کرنا خطا تو سہل ہے۔ اخفا محال ہے
میرا یہ کام بھی تو وہ ستّار کر گیا

☆

آپؐ آئے تو رسموں کے سائے گئے
شیطنت کے نشاں سب مٹائے گئے
کعبے سے بُت بھی سارے اٹھائے گئے
عشق و وحدت کے سب گرُ سکھائے گئے
وہ شریعت ملی کہ جو فانی نہیں
ہاں محمدؐ کا کوئی بھی ثانی نہیں

☆

اگر تجھے ہو سمجھ آمدِ مسیح کیا ہے
بتانے دنیا کو ہر سمت تُو رسا ہو گا
جنہوں نے شمسؔ ہے مانا مسیحِ دوراں کو
انہی کے واسطے اب میرا دل فنا ہو گا

☆

کوئی پوچھے کہ کیسے امّتِ مرحوم ہو زندہ
کہو اس کی حیاتِ نَو کا باعث بھی خلافت ہے
تھا پہلے نورِ دیں، محمود، ناصر اور طاہر کا
وہی مسرور کا اب نورِ پیشانی خلافت ہے

شمس کی شاعری میں رومانویت اور تغزّل کا عنصر بھی نمایاں ہے اور اس کی طبع رواں یہاں بھی گل فشانی کے جوہر دکھاتی ہے مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دل کے پیغام کو میں کیسے مجسّم کر دوں
پاسباں رسموں کے بنتے ہیں زمانے والے
جنبشِ لب کی تمنّا میں ہیں اہلِ محفل
مست آنکھوں میں ہی ہر راز چھپانے والے
لب کی رخسار کی پلکوں کی ہے خوبی اپنی
نقش سب مل کر ہیں اک جادو رچانے والے

☆

کہاں سے بات چلی تھی کہاں پہ آ ٹھہری
تمہارے لب سے چلی تھی کلی پہ جا ٹھہری
حسین اور بھی ہیں پر یہ امتزاجِ نقوش
ہماری آنکھ اِسی معجزے پہ جا ٹھہری

☆

ہمارے فلاح الدین شمس کو اپنے پردیسی ہونے کا احساس بھی ہے اور یہ بھی کہ پرانی یادیں اس کے دامنِ دل میں رچی بسی ہیں۔ اس کی نظم ربوہ کی یادیں اور پردیس انہی یادوں کا اظہار یہ ہیں

کس کو اے شمس سمجھ بیٹھے ہو گھر اپنا
کوئی نہ ٹھہرے گا ہم سب ہیں یہاں پردیسی
اونچے گھر بھی بہت اور دکانیں حسیں
پر نہ بچپن کی مجھ کو وہ سڑکیں ملیں

شمس کی شاعری میں کہیں کہیں مزاح کی چاشنی بھی مسکراتی ہے اس کی نظم ''بڑھاپے کے عذاب'' میں آپ کو جابجا یہ عنصر دکھائی دے گا۔

مختصر یہ کہ فلاح الدین شمس کی شاعری میں فن کا وہ سفر اس کی طرح دکھائی دیتا ہے جو مسلسل جستجو اور تلاش میں سرگرداں ہے اب دیکھئے یہ کس منزل پر پڑاؤ ڈالتا ہے۔

شمس نے خود کہا ہے۔

جسے ڈھونڈ ڈھونڈ میں تھک گیا
ایک لمبا عرصہ گزر گیا
چھپا دل میں تھا پتہ چل گیا
کسی اور در میں نہ اب گیا
اُسے شمس اپنا بنائے گا
اُسے کس طریق منائے گا؟
اُسے دل سے کیسے لگائے گا؟
اُسی سے سکوں کو پائے گا
یہ سبق بھی کون پڑھائے گا؟
اب میں اِس تلاش میں چل دیا

پروفیسر مبارک احمد عابد

16 دسمبر 2023ء
پاکستان

احمدیہ دبستان شاعری میں ایک منفرد اضافہ

’’شرف تکلّم‘‘

کتاب ’’شرف تکلّم‘‘ سیکھوانی برادرز کے خانوادہ سے تعلق رکھنے والے مکرم محترم فلاح الدین شمسؔ صاحب خلف الرشید حضرت مولانا جلال الدین شمسؔ رضی اللہ کی شاعری اور خوش گفتاری کا ایک ممتاز اور منفرد مجموعہ ہے جو شاعری کے دلچسپ اور متنوع میدان میں قارئین کو لے جاتا ہے۔ یہ کتاب مختلف زمانوں میں کہے گئے اشعار اور تخلیقات پر مبنی ہے۔ جس میں مختلف موضوعات اور زمانوں کا بھرپور انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب ’’شرف تکلّم‘‘ کی زبان اور انداز میں ایک منفرد سلاست، سادگی، خوبصورتی اور رنگ جمال ہے۔ شاعرانہ اظہار اور بہترین الفاظ کا انتخاب، قارئین کو شاعری کے مفاہیم کو بہترین اور سادہ طریق سے سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ کتاب میں مختلف زمانوں، موضوعات، مواضع اور حالات کی شاعری کا مجموعہ شامل ہے۔ فلاح الدین شمس صاحب کی شاعری میں جو مضامین کا تنوع پیدا کیا گیا ہے تا کہ قارئین مختلف حالات اور مضامین میں خود کو تلاش کریں۔ ’’شرف تکلّم‘‘ میں شاعری کی گہرائی اور فلسفے اور جذبات کو سمجھنے کے لئے قارئین کو مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ کتاب میں مختلف مضامین پر کی گئی طبع آزمائی نے قارئین کے احساس تفکر کا جگایا ہے اور قارئین کو متاثر کرنے والے اہم پیغامات دیئے ہیں، جو عشق حقیقی، حقیقت زندگی اور حیات بعد الموت جیسے اہم موضوعات پر مبنی ہیں اور قارئین کی زندگی میں بہتری لانے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ ’’شرف تکلّم‘‘ ایک مستند کتاب ہے جو شاعری کے شوقینوں کے لئے معنوی اور جذباتی راہنمائی فراہم کرتی ہے۔ یہ کتاب شاعری کے فن میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے لازمی ہے جو سوچ، فکر، حسن لطیف اور پاکیزہ جذبات کے خطابیہ انداز میں شاعری کی دنیا میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

صفی اللہ خان

حمد

وہ ہے جو مشکلوں میں مجھے پار کر گیا
رگ رگ کو میری پیار سے سرشار کر گیا

تھا میرا ظرف کم کہ جو مانگا بہت ہی کم
وہ فضل اپنے مجھ پہ لگا تار کر گیا

جتنے تھے میرے بوجھ اس نے ہلکے کر دیئے
اک بار ہی نہیں وہ تو ہر بار کر گیا

کرنا خطا تو سہل ہے، اِخفا محال ہے
میرا یہ کام بھی تو وہ ستّار کر گیا

احسان ہے یہ اُس کا کہ مجھ سے حقیر کو
اپنی محبتوں میں گرفتار کر گیا

اتنی وفا دکھائی ہے اور التفات بھی
کہ اور در پہ جانے سے لاچار کر گیا

اس عشق کے علاوہ تو کچھ سوجھتا نہیں
اس مرضِ لاعلاج کا بیمار کر گیا

اب دل میں کوئی اور ہو ممکن نہیں رہا
احسان اتنے کر کے شرمسار کر گیا

ہے اُس کا یہ کمال کہ اِس کائنات میں
مجھ پہ وہ اپنی ذات کا اظہار کر گیا

وہ ہے جو دل میں ڈال کے احباب کے مِرے
کتنوں کو میرے واسطے دل دار کر گیا

جس کو میں ڈھونڈتا تھا کہیں آسمان میں
میرے ہی دل میں آکے وہ گفتار کر گیا

خود ہی بتائے عجز کی عادت کے سارے راز
دے کر یہ علم مجھ کو سمجھ دار کر گیا

خدمت قبول کر کے کیا مجھ کو سُرخ رُو
میرے نصیب کو یوں چمک دار کرگیا

ہر سمت اُس کا چہرہ نظر آئے ہے مجھے
جلوہ نمائی اپنی یوں بیدار کر گیا

اُس کا کرم ہے جب بھی اُسے بھولنے لگا
وہ پھر سے مجھ پہ خود کو نمودار کرگیا

اب اُس کے در سے شمسؔ اُٹھیں ہم تو کِس طرح
وہ کب سے ہم کو اپنا پرستار کر گیا

نعت

یہ حقیقت ہے قصہؔ کہانی نہیں
کہ محمدؐ کا کوئی بھی ثانی نہیں

روزِ معراج موسیٰؑ پہ تھی برتری
زندگی مُردوں کو عیسیٰؑ سے بڑھ کے دی

صبرِ ایوبؑ سے حد بڑھی صبر کی
پاک دامانی یوسفؑ سے آگے بڑھی

آپؐ سی کوئی روح آسمانی نہیں
ہاں محمدؐ کا کوئی بھی ثانی نہیں

آپؐ آئے تو رسموں کے سائے گئے
شیطنت کے نشاں سب مٹائے گئے

کعبے سے بُت بھی سارے اٹھائے گئے
عشق و وحدت کے سب گُر سکھائے گئے

وہ شریعت ملی جو کہ فانی نہیں
ہاں محمدؐ کا کوئی بھی ثانی نہیں

آپ کی برکتوں سے ہوا معجزہ
صدقے لاکھوں کہ آیا مسیحا مِرا

جو زمیں پر ثریّا سے ایمان کا
پھر سے لے آیا ہے سرمدیں سلسلہ

کون کہتا ہے وہ جاودانی نہیں
ہاں محمدؐ کا کوئی بھی ثانی نہیں

آپ کا ہم کو سایۂ شفقت ملے
آپ کی روزِ محشر شفاعت ملے

آپ کی برکتوں میں سے برکت ملے
شمسؔ کو آپ کی کاش قربت ملے

اِس سے بڑھ کر کوئی مہربانی نہیں
یہ حقیقت ہے قصّہ کہانی نہیں

کہ محمدؐ کا کوئی بھی ثانی نہیں
یہ حقیقت ہے قصّہ کہانی نہیں

کبھی دیکھو تو

ہیچ ہو جائیں گے مے خانے زمانے بھر کے
جامِ کوثر سے اِن ہونٹوں کو لگا کر کبھی دیکھو

ڈھونڈتے ہو اُسے کیا تاروں میں سیّاروں میں
اپنے ہی دل میں ذرا پردے ہٹا کر کبھی دیکھو

طور کی آگ میں اب کوئی حرارت نہ رہی
اب تو فاران کے شعلے کو جلا کر کبھی دیکھو

کیا سناتے ہو ہمیں ِ عشق مجازی کا مزا
دل میں اب ِ عشق حجازی کو بسا کر کبھی دیکھو

شرق سے چمکی ہے بجلی جو مسیحائی کی
اُسے دنیا کے ہر اک کونے میں جا کر کبھی دیکھو

ہم کو چڑھا کے صلیبوں پہ جو خوش ہوتے ہو
دشمنِ عیسیٰؑ کی تاریخ اٹھا کر کبھی دیکھو

شمسؔ ہم چشم سے کرتے ہیں عیاں دل کا بیاں
سیکھو اب ہم سے ہی اور اشک بہا کر کبھی دیکھو

ترانۂ احمدی

یوں پُل صراط سے ہم کامگار گزریں گے
نبیؐ کے ہاتھ کو تھامیں گے پار گزریں گے

ہمارے دل میں ہے اس نور کی شمع روشن
درود و ورد میں لیل ونہار گزریں گے

صحابہ جن پہ خدا کی رضا ہوئی ظاہر
اُنہی کی راہوں سے احمد کے یار گزریں گے

اُسی محمدی مشعل کو ہاتھ میں لے کر
ہر ایک کوہ و سمندر کے پار گزریں گے

صلیبِ عیسیٰؑ پہ ہیں جن کی گردنیں اونچی
رہِ حرم میں وہی شرمسار گزریں گے

مسیحی کشتی پہ نہ لی پناہ تو اہلِ زمیں
زمانے نوحؑ کے پھر ایک بار گزریں گے

پیام دینا صبا ”. اے محمدِؐ عَرَبی
تِرے لئے تو ہمالہ ہزار گزریں گے“

ہم ابراہیمی نظاروں کو زندہ کر دیں گے
بھڑکتی آگ سے دیوانہ وار گزریں گے

مقامِ شکوہ نہیں ہے وفا کے رستے میں
ہر ابتلا سے بخوشی، باوقار گزریں گے

عدُو کو شک ہے مگر شمسؔ اُس کے چہرے پر
نشان دیکھ کے یاس و غبار گزریں گے

آمدِ مسیح

مسیحِ وقت کے آنے پہ کیا ہوا ہوگا
نزولِ کرّوبیاں کا بھی سلسلہ ہوگا

جو نور دین کا رکھتے ہیں پہلے آتے ہیں
سلام دیتے نبیؐ کا سماں وہ کیا ہوگا

تھی جن کی صفت دجّالی وہ جل رہے ہوں گے
جو رکھتا نیک تھا فطرت وہ با وفا ہوگا

حکومتیں ہیں جہاں بھی کسی کی کیسی ہے شان
مسیح ہیں آگئے اب مصطفیٰؐ ہی شاہ ہوگا

اگر تجھے ہو سمجھ آمدِ مسیح کیا ہے
بتانے دُنیا کو ہر سمت تُو رسا ہوگا

خدا رسول کی پروا نہ اب کسی کو رہی
یہی تو مرض ہے جس کی مسیح شفا ہوگا

زمانہ سارا کھڑا ہو مسیح کی راہوں میں
خدا اٹھائے گا اس کو وہ پھر رہا ہوگا

مسیحی شمع سے جب بھی جلے گا پروانہ
اُسی کے نور سے زندہ وہ پھر سدا ہو گا

جنہوں نے شمسؔ ہے مانا مسیحِ دوراں کو
انہی کے واسطے اب میرا دل فنا ہوگا۔

خلافت سو سالہ جوبلی

کہا جاتا ہے جسکو قدرتِ ثانی خلافت ہے
جو اتری اوّلیں وہ نعمتِ ربّی خلافت ہے

خدا نے کر دی ہے تصدیق سورہ نور میں ظاہر
ہمارے ہر عمل میں روحِ ایمانی خلافت ہے

بتائے یہ زمانہ کتنے ہیں ایسے نظامِ نو
قیادت ان کی عالی ہو کہ یہ جیسی خلافت ہے

کوئی پوچھے کہ کیسے اُمّتِ مرحوم ہو زندہ
کہو اسکی حیاتِ نَو کا باعث بھی خلافت ہے

تھا پہلے نُور دیں، محمود، ناصر اور طاہر کا
وہی مسرور کا اب نُورِ پیشانی خلافت ہے

کناروں پر زمیں کے پہنچی ہے تبلیغ احمد کی
اگر سوچیں پسِ پردہ مہربانی خلافت ہے

نشیمن بجلیوں سے اسلئے محفوظ ہے اپنا
کہ ہم پہ سایہءِ انوارِ ربّانی خلافت ہے

کئی آمرِ اُٹھے سَو سال سے اِسکے بُجھانے کو
دیا نہ یہ بُجھا جس سے جِلا پائی خلافت ہے

خدایا تو قیامت تک اسے آباد ہی رکھیو
ہمارا میکدہ عرفان کا ساقی خلافت ہے

یہی ہے شمسؔ آن اپنی یہی ہے شان دُنیا میں
ہماری روح کی ہر آنِ تابانی خلافت ہے

تم کہاں جاؤ گے (رومانوی)

میرے روز اور شب،لوٹ کر بے سبب
مجھ سے کہتے ہو اب، تم کہاں جاؤ گے؟

نغمہ ہائے سخن، تم سے تھے خندہ زن
چھوڑ کر میرا من،تم کہاں جاؤ گے؟

بھول کر تیری رہ میں بھی چلتا رہا
دل نے ہر دم کہا۔ تم کہاں جاؤ گے؟

جیسے بھی جاؤنگا۔ میں چلا جاؤں گا
پوچھتا جاؤنگا۔ تم کہاں جاؤ گے؟

تم ہو میرے صنم،دل میں ہو دم بدم
پوچھو خود سے بلم. تم کہاں جاؤ گے؟

اسکی پلکیں کماں، آنکھیں ناوک نشاں
اب نہیں ہے اماں۔ تم کہاں جاؤگے؟

دے دیا مجھ کو غم،آنکھیں میری ہیں نم
ڈھا کے اتنے ستم۔تم کہاں جاؤ گے؟

سُن مرِے ہمسفر،راستوں کا ہے ڈر
اب مجھے چھوڑ کر، تم کہاں جاؤگے؟

حُسن کا کیا پتہ۔ عشق لا انتہا
حسن ڈھل جائے گا۔ تم کہاں جاؤ گے؟

اُسکے گلشن چلیں۔ پھول کلیاں چُنیں
شکرِ یزداں کریں۔ تم کہاں جاؤ گے؟

تم کہاں جاؤ گے (سنجیدہ)

اونچے تیرے محل، کیا کرے گا تُو کل
بولے گا جب بگل۔ تم کہاں جاؤ گے؟

سر نگوں ہو گئے۔ بے ستوں ہوگئے
اک فسوں ہو گئے۔ تم کہاں جاؤگے؟
رات ڈھل جائیگی۔ روشنی چھائے گی
بات کھل جائے گی۔ تم کہاں جاؤگے؟

دیپ نفرت بھرا ، چند لمحے جلا
وہ اگر بُجھ گیا۔ تم کہاں جاؤگے؟
وقت ٹل جائے گا۔ راز کھل جائیگا
پردہ اٹھ جائے گا۔ تم کہاں جاؤ گے؟

تیری مکّاریاں ۔ تیری عیّاریاں
جب کھلیں گی میاں ۔ تم کہاں جاؤگے؟
جو ِکیا رات بھر۔ صبر کا وہ اثر
لائے گا جب سحر۔ تم کہاں جاؤ گے؟

روح پرور فضا۔جب کرے گی صبا
تم ہی بولو ذرا۔ تم کہاں جاؤ گے؟

چارہ گر دیکھو نا۔ تم ہو سب آشنا
اُسکو اب کہہ دو نا۔ تم کہاں جاؤ گے؟

شمسؔ بے بس ہو تم۔یونہی فکروں میں گم؟
لے کے خالی یہ خُم۔ تم کہاں جاؤ گے؟

تم کہاں جاؤ گے؟

دنیائے امتحان

ہمارے سامنے قدغن جو کوہ لگاتا ہے
کہیں سے اک نیا رستہ نکلتا آتا ہے

چھلکنا اس کا تلاطم میں خود بدل جائے
لرزتے ہاتھوں سے جب جام وہ تھماتا ہے

تمہارے واسطے کیا کچھ نہیں کیا ہم نے
کہ جذبِ عیسیٰؑ و منصور رُخ دکھاتا ہے

کیاجوانی کو اس دل نے کیسے نذرِ گنہِ
یہ سوچ سوچ کے اب کیسے گڑگڑاتا ہے

یہ سوچتے ہوئے ہر غم کو جھیلا ہے ہم نے
یہ سب ہیں زاویے تُو جن سے آزماتا ہے

ہمارا ناز تھا اب تک کمالِ عشقِ بُتاں
زوالِ حُسن کا اب خوف بھی ستاتا ہے

نہ رنج ماضی کا ہے اور نہ خوفِ فردا ہی
بہشت ہے یہی دل جس میں مسکراتا ہے

یہ صبر لائے گا فصلِ بہار بھی اک دن
خزاں کے بعد ہی ہر پھول کھلکھلاتا ہے

میں شمسؔ کیا ہوں کہ اسرار کا ہوں مجموعہ
مری کہانی پہ ہر کوئی جھینپ جاتا ہے

مناجاتِ عشق

نہ دل مچلتے ہیں اور حسن میں بھی شوخی نہیں
یہ کیسا مجمع ہے کیسا دیار ہے پیارے

تڑپتے رہنے میں ہے زندگی کا دارومدار
تو مت یہ پوچھ کہاں پر قرار ہے پیارے

زمیں پہ پھولوں کی شوخی کو یہ بھی یاد رہے
خزاں کا دَور بھی بعد از بہار ہے پیارے

شفا ہزاروں نے پائی ہے اُس مسیحا سے
گمان دل میں ترے کیوں ہزار ہے پیارے

تُو سمجھے ظلم ترا کم ہے گر کبھی دیکھے
صلہ جو مجھ کو مِلے بار بار ہے پیارے

بس اس کے نام پہ چاہے عدو تو جاں لے لے
یہ جاں تو عرصے سے تجھ پر نثار ہے پیارے

دیارِ غیر میں بیٹھے ہوئے ہیں ہم لیکن
تمہاری یاد ہی لیل و نہار ہے پیارے

گو بادہ کش نہیں لیکن کبھی دعا مانگیں
برستی مے کی گھٹا شعلہ بار ہے پیارے

نہ رال ٹپکی ہے جنت پہ اور ہے کیا دوزخ
تمہارے عشق سے ہم کو تو کار ہے پیارے

مری ہنسی نے مرے دل کو کیا دیا دھوکا
سفر تو عشق کا زار و نزار ہے پیارے

وہ دل جو سوئے تھے اُٹھ کر بلائیں لینے لگے
اذان شمسؔ کی ابرِ بہار ہے پیارے

مسجد براز یل کی بنیاد پر

اک نئی دھرتی نیا اک آسماں لانے کو ہے
پہلی مسجد یہ خُدا کا جلوہ دکھلانے کو ہے

اک عجب سا ہے تلاطم دل میں میرے موجزن
شکرِ اللہ پاک سے اب آنکھ بھر آنے کو ہے

نُوح کی کشتی بنے گی مہدیِٔ دوراں کے فیض
ہر طرف آثار ہیں طوفاں بڑا آنے کو ہے

اب جنوبی خطّہءِ امریکہ کے بھی درمیاں
وحدتِ یزداں کا سایہ شان سے چھانے کو ہے

محترم مسرور جسکے ساتھ ہے ربِّ کریم
ہے یہ اُسکی ہی دُعا۔ اعجاز دکھلانے کو ہے

پیٹراپولس کی ہے یہ قسمت آفریں صد آفریں
گلشنِ احمد کا غُنچہ اس میں کِھل جانے کو ہے۔

ہونگے کچھ شمشاد بھی اور ہونگے کتنے ہی گلاب
ہر طرف ہریالی اور لالی بکھر جانے کو ہے

کوہ کے دامن میں قد آور شجر بے انتہا
مسکنِ رحماں یہاں آباد ہو جانے کو ہے

ہر موٴذّن دے گا دعوت آنے کی جانب فلاح
دیکھنا باطل کی اب آواز دب جانے کو ہے

ہم کو نفرت نہ کسی سے کرتے ہیں اعلان یہ
گھر محبت کا یہاں تعمیر ہو جانے کو ہے

ثبت ہے جس پر مرے پیارے محمدؐ کا نشاں
جھنڈا اس خطے میں اپنی شاں سے لہرانے کو ہے

برق جو صد سال پہلے شرق سے روشن ہوئی
وہ برازیلی فضا میں اب چمک جانے کو ہے

مانے یا نہ کوئی مانے ہے ہمیں کامل یقیں
نغمہ ہائے احمدیت ہر کوئی گانے کو ہے

ہاتھ جس جس نے بٹائے ظفر ہے انکے لئے
اجر محنت کا اب اُنکو جلد مل جانے کو ہے

ہو مُبارک سب کو جو دل سے ہمارے ہیں ندیم
معجزہ اک اور نظروں سے گزر جانے کو ہے

کفر خندہ زن تھا ہر سُو ایک عرصہ ہو چکا
غلبۂ دیں اب یہی سمجھو کہ بس آنے کو ہے

یہ خُدا کی باتیں ہیں جو پوری ہو نگی ایک دن
ورنہ اپنی حیثیت میں کچھ نہ بتلانے کو ہے

بات پوری ہو گئی میرے رسولِ پاک کی
شمسؔ اب اسلام کا پچھم سے چڑھ جانے کو ہے

ہستیٔ اسرار

فرض کعبے کے نبھاتا ہوں صنم خانوں میں
مجھ سا کافر نہ ہوا پیدا مسلمانوں میں

ایک ہی سُر میں ملاتا ہوں میں دین اور دنیا
میں نرالا ہوں جہاں بھر کے نَواخوانوں میں

داستاں میری گو ہر اک سمجھ لے اپنی
مرتبہ مجھ کو وہ حاصل ہے حُدی خوانوں میں

پارسا جو ہیں وہ ہیں مجھ سے دعا کے طالب
رند لیتے ہیں بلائیں میری مے خانوں میں

ہستی مَیں ایک ہوں مجموعۂ اسرار بھی ہوں
تم کہانی میری پاؤ گے توافسانوں میں

میرا رشتہ بھی امیری سے عجب رنگ کا ہے
میں خوشی پاتا ہوں غربت بھرے انسانوں میں

نہیں محدود وفائیں مری احباب تلک
ہے میرا تذکرہ اغیار کے کاشانوں میں

زاہد و شیخ کی ہر بات وہاں ڈوب گئی
دکھ سے لبریز میری آہوں کے پیمانوں میں

تم بجھاؤ مرے مرقد پہ یہ جلتے دیپک
شمع گر مجھ کو سمجھتی نہیں پروانوں میں

شمسؔ اک روز یہ تسلیم کرے گی دنیا
ہم نے صحرا کو بدل ڈالا گلستانوں میں

دنیائے فانی کا سفر

دریا میں مثلِ قطرہ بہے جا رہا ہوں میں
ساگر کی کھوج میں ہوں چلے جا رہا ہوں میں

لیکر ہوائیں مجھ کو چلی جا رہی ہیں یوں
تنکا ہوں یا کہ خاک اُڑے جا رہا ہوں میں

بے فکر ہو کے کس طرح انجامِ عشق سے
اُسکی ہر اک ادا پہ ہنسے جا رہا ہوں میں

ایسے گناہ جن کو مکمل نہ کر سکا
ان کی سزا بھی بھگتے چلے جا رہا ہوں میں

رحمت پہ اُس کی مجھ کو مکمل یقین ہے
پھر کیوں بخوفِ یزداں۔ڈرے جارہاہوں میں؟

دیتے تھے آسراجو ۔ تماشائی بن گئے
اٹھ اٹھ کے ہر قدم پہ گرے جارہاہوں میں

ساحل کو دیکھتا ہوں بڑی بیکسی کے ساتھ
گرداب میں ہوں اور گِھرے جارہاہوں میں

ہے شہرتِ زمانہ کبھی مال و زر کی آس
بُت کیسے بے حسی سے گھڑے جارہاہوں میں

ہنستا ہوں سب کے ساتھ تفنّن کے کھیل میں
سچ ہے کہ دل ہی دل میں جلے جا رہا ہوں میں

پھولوں کے اس چمن میں کانٹوں سے بچ کے رہ
سنتا ہے کون؟ کب سے۔ کہے جا رہا ہوں میں

تھم جائے نہ کہیں یہ جام ِیادِ رفتگاں
لے لے کے خطرہ مُول۔ پیئے جا رہا ہوں میں

یہ سب غلط بیانی ہے اور افتراء کی بات
سب جانتے ہوئے بھی سُنے جا رہا ہوں میں

اس وادیِٔ گناہ میں یہ بھی تو ہے گناہ
اوروں کے جو گناہ گنِے جا رہا ہوں میں

جُرأت کہاں گئی کہ بُرے کو بُرا کہیں
یہ بات کرنے پر ہی۔ ڈرے جا رہا ہوں میں

دنیا کی لذّتوں کا۔ عبادت کا شوق بھی
دونوں کے درمیان پسے جا رہا ہوں میں

میں شمسؔ ناتوان ہوں اور ہوں ستم رسید
مشکل ہے یا کہ سہل جئے جا رہا ہوں میں

پتھر سے گہر تک

صبر لازم ہے محبت کا اثر ہونے تک
مدتیں لگتی ہیں پتھر کو گہر ہونے تک

کب سے اندھیروں میں پروانے پھریں گم گشتہ
مشعلِ راہ بنی شمع سحر ہونے تک

یوں تو انساں کو دیا شرفِ تکلم اُس نے
کتنی صدیاں لگیں نبیوں کی مہر ہونے تک

طور کی آگ کے سہنے کی سکت مجھ میں کہاں
بھسم ہو جاؤں گا میں دیدِ شرر ہونے تک

ہم تو وہ لوگ ہیں جو دل کو فروزاں کر کے
بیٹھے کب سے ہیں دھنک رنگ سحر ہونے تک

کارواں تو نہ رُکا دیں اُسے آوازیں بہت
نقشِ پا دیکھا کئے حدِّ نظر ہونے تک

اپنی شمع کے ہیں پروانے فقط اُس کے لئے
جاں ہتھیلی پہ رکھیں عمر بسر ہونے تک

اک بشر کا کہیں آسان ہے اِنساں ہونا؟
جاری رہتا ہے سفر۔ عمرِ خضر ہونے تک

کیا مسلماں ہیں ہم دل میں لئے عشقِ صنم
اسکے کوچے میں رہیں خونِ جگر ہونے تک

شمسؔ دکھلاؤ ابھی صبر کہ تم کو تو یہاں
جاں لُٹانی ہے ابھی اسکو خبر ہونے تک

ربوہ کی یادیں

اب نہ راتیں رہیں شب براتیں رہیں
عمر بھر کی مری اب نہ یادیں رہیں

گھر کا آنگن مرا جانے کیا ہو گیا؟
کوّوں کی اب کہیں کائیں کائیں نہیں

مرغیوں کا وہ پھرنا صحن میں گیا
رات کو تاروں کی وہ براتیں گئیں

اونچے گھر بھی بہت اور دکانیں حسیں
پر نہ بچپن کی مُجھ کو وُہ سڑکیں ملیں

کتنے مرغے جگاتے تھے صبح مجھے
ایک عرصے سے اب نہ وہ بانگیں سنیں

پڑھتے اخبار"مشرق" کو تھے ہم زباں
ساری دنیا کی تھی جس میں خبریں پڑھیں

جن حریفانہ ملکوں کو دی گالیاں
اُنہی ملکوں میں سب آج ہم ہیں مکیں

مل گئی مجھ کو کھانے کی ہر شئے مگر
ماں کے ہاتھوں کی اب پھلکیاں ہیں کہیں؟

دھنسنا کیچڑ میں میرا جو بارش ہوئی
جانے کس رُخ پہ اب وہ گھٹائیں گئیں؟

آندھی میں جب جھکا کے کمر چلتا تھا
نظر آتی نہ مجھ کو کہیں چیزیں تھیں

بِن بُلائے بھی جانا تھا دستور عام
شادیوں کی نشانی بڑی دیگیں تھیں

ٹاپیں گھوڑے کی تانگے پہ جاتے ہوئے
میرے کانوں میں بجتی ہیں کر لیں یقیں

جن سکولوں میں لکھتے تھے ہم تختیاں
پنسلیں ہیں وہاں کاپیاں ہیں پڑیں

چھابڑی سے لئے چھولے آنے کے بس
اور ہم پھر ٹھہر کر وہ کھائیں وہیں

نہ جہازوں کا غم تھا نہ کاروں کا غم
پاؤں لے جاتے تھے جب بھی جائیں کہیں

اپنے بازار میں پھرتے تھے نو جواں
اور تاروں سے بنتی تھیں شامیں حسیں

عزّتِ نفس کا مرد تھا پاسباں
پُر حیا ہوتی تھیں پارسائیں حسیں

وقتِ رخصت یہ میں نے بھی سوچا نہ تھا
یاد پیدا کرے گی یوں دل میں حزیں

جیسا چھوڑا تھا میں نے نہیں وہ رہا
کہتے ہیں سب مجھے جو وہاں ہیں مکیں

میرے شہرِ مکرّم میں دن تھے بھلے
میرے خوابوں میں کب گولیاں تھیں چلیں؟

مسجدوں میں اذاں اب تو ہوتی نہیں
ہم دعا دے کے بن جاتے ہیں مجرمیں

کس نے کیا کردیا؟ - بَن گیا سانحہ
ہم ہیں قاتل اور مقتول بھی ہیں ہمیں

سب میسّر ہے مُجھ کو مگر ساقیا
کچھ پلا دے سکوں سے ہوں دل پُر یقیں

میری یادوں کو اب دفن کر ڈالو تُم
بھاڑ میں نہ سہی پر یہ جائیں کہیں

یادِ ماضی کو میں نہ بُھلا پاؤں گا
کتنے پیارے تھے دن اور وہ راتیں حسیں

شمسؔ عرصہ ہوا کیا سے کیا ہو گیا
نقش باقی ہیں گرچہ وہ یادیں گئیں

عمر بھر کی مری اب نہ یادیں رہیں
کب وہ راتیں رہیں شب براتیں رہیں

آخری حساب کتاب

مجھے اِس پار سے اُس پار چلے جانا ہے
جو کمایا تھا ابھی تک وہ مجھے پانا ہے

میری نظروں سے گزر جائیں گے سارے لمحے
کب حسیں خواب میں ماضی سے لپٹ جانا ہے
لرزشوں کو مرے سانچے میں بسایا کس نے
یہ مرے جرم نہیں۔ اُسکو یہ سمجھانا ہے

سودا کس مُول پہ ہوگا نہیں ہے کچھ پروا
اُسکی قربت کو کسی طور مجھے پانا ہے
بات نہ اُسکی کرو دل کو بہلنے دو ذرا
ذکر گر اُس کا ہوا آنکھ نے بھر آنا ہے

جان بھی مال بھی عزت بھی ودیعت اُسکی
جو بھی واپس کروں۔ تو کیسا یہ نذرانہ ہے
کیا حجاب اُس سے اگر دُوں میں اُسے اپنا حساب
اُس کو معلوم ہے تو۔ کیا اُسے بتلانا ہے

ساری تدبیروں سے بس یہ نہیں آیا مجھ کو
کیسے تدبیر سے تقدیر کو مٹوانا ہے

تھا جبلّت میں مری عشق۔ سو میں نے وہ کیا
اب یہ الزام ہے معشوق غلط مانا ہے

ہر طرح سود و زیاں کر بھی دیا میں نے بیاں
کیا کریں دل کا۔ اُسی شمع کا پروانہ ہے

برق اب اس پہ گرا دو یا کرو نذرِ ہوا
یہ نشیمن ہے میرا یہ ترا نذرانہ ہے

ایک ہی گرُ ہے کہ ہر ایک دعا ہو مقبول
آنکھ کے پانی نے ہر پاپ کو دُھلوانا ہے

داستاں سُن کے میری کہتے ہیں مرے ہمدم
یہ تری بات نہیں۔ میرا یہ افسانہ ہے

شمس اک جبرِ مسلسل سے ہے ہر کام یہاں
اس سفر میں یہی ہر ایک کو پیش آنا ہے

عمر بھر کی تلاش

کسی کارواں کی تلاش تھی
مجھے اک خضر کی تلاش تھی
اک چارہ گر کی تلاش تھی
کسی ہمسفر کی تلاش تھی
میرا بھی تو ہو کوئی راہ نما
میں اسی تلاش میں چل دیا

میرے دل میں مخفی اگر آس تھی
کچھ عجب سی روح میں پیاس تھی
کہ خوشی بھی کوئی نہ راس تھی
کوئی چیز میرے نہ پاس تھی
مجھے یہ جنون ہے کیوں ہوا
میں اسی تلاش میں چل دیا

میرے ساتھیو میرا ساتھ دو
میرے ہاتھ میں کوئی ہاتھ دو
کوئی دو قدم کا تو ساتھ دو
میرے غم میں میرا بھی ساتھ دو
میری کون سُنتا ہے یہ دُعا
میں اسی تلاش میں چل دیا

کئی کارواں مجھے مل گئے
وہ خضر بغیر ہی چل دیئے
میرے ہم قدم نہ وہ چل سکے
یا وہ مجھ کو چھوڑ کے چل دیئے
مجھے پانی ہے کوئی اور راہ
میں اسی تلاش میں چل دیا

وہ جو دن بہار کے آئے تھے
وہ خزاں بھی ساتھ ہی لائے تھے
وہ خوشی بھی غم بھی تو لائے تھے
میرے من کو دونوں نہ بھائے تھے
کہیں ہو گی میرے سکوں کی جا
میں اسی تلاش میں چل دیا

کئی راہ نما بھی ملے مُجھے
میرے پاسباں بھی ہوُا کئے
کئی دوست بن کے گلے ملے
میرے ہمسفر نہ لگے مجھے
مجھے منزلوں کا جنون تھا
میں اسی تلاش میں چل دیا

مجھے لگتا ہر کوئی خار تھا
کوئی بھوت سر پہ سوار تھا
نہ مجھے سکوں نہ قرار تھا
کسی سے بھی دل سے نہ پیار تھا
کیا میری انا کا خُمار تھا
میں اسی تلاش میں چل دیا

مجھے یہ بھی ہونے لگا شبہ
میری منزلیں میرا راستہ
ہیں یہ دونوں ایک ہی کیا پتہ
میرے دل کو کس سے ہے واسطہ
میں نہ کچھ بھی اس کو سمجھ سکا
میں اسی تلاش میں چل دیا

پڑے آبلے میرے پاؤں میں
میں پھرا ہوں دُھوپ اور چھاؤں میں
تھی کشش بڑی کسی ناؤں میں
وہ مِلا نہ شہر نہ گاؤں میں
وُہ خُدا ہی جانے ہے کس جگہ
میں اسی تلاش میں چل دیا

مجھے کون اپنا بنائے گا
مجھے دل سے اپنے لگائے گا
جو سکوں بھی مجھ کو دلائے گا
میرے دل میں پیار بسائے گا
کبھی سامنے تو وہ آئے گا
میں اسی تلاش میں چل دیا

جسے ڈھونڈ ڈھونڈ میں تھک گیا
اک لمبا عرصہ گزر گیا
چُھپا دل میں تھا۔ پتہ لگ گیا
کسی اور در نہ میں اب گیا
اُسے شمسؔ اپنا بنائے گا
اُسے کس طریق منائے گا؟

اُسے دل سے کیسے لگائے گا؟
اُسی سے سکون کو پائے گا
یہ سبق بھی کون پڑھائے گا؟
اب میں اِس تلاش میں چل دیا

باقی ہے

اُسی کی سانسوں کی خوشبو ہوا میں باقی ہے
چلا گیا وہ نشہ سا فضا میں باقی ہے

گزر گئے ہیں کئی جب تو یہ بھی سہہ لیں گے
یہ امتحان جو راہِ وفا میں باقی ہے

لگا لو زور بہت تم مجھے مٹانے پر
سدا سنو گے مری جاں انا میں باقی ہے

اتارا لحد میں مجھ کو تو سب یہ کہنے لگے
رَمَق ابھی مرِے دل کی صدا میں باقی ہے

پیام دے دو کمیں گاہ کے مکینوں کو
چلا لو تیر جو دستِ جفا میں باقی ہے

رقیب جلتا ہے پیرِ مغاں کے ہوش تمام
نشہ وہ تیری نگہِ سُرمہ سا میں باقی ہے

گھرِے ہیں جب کبھی بادل وہ زلفیں یاد آئیں
حسین یاد وہ ذہنِ رسا میں باقی ہے

ہمارے دل میں اگر جھک کے تم کبھی دیکھو
اُسی کا عشق ہی اِس غم سرا میں باقی ہے

مثال ہی نہیں اُسکی نزاکتِ لب کی
کہاں وہ نازکی گُل کی ادا میں باقی ہے

وہ میرے پہلو سے اٹھ کر جو چل دیئے یکدم
کمی رہی نہیں قہرِ خدا میں باقی ہے

دیار والو کہیں کیا فسانۂ غربت
کوئی ستم نہ رہا اس سزا میں باقی ہے

جو چارہ گر کی ہی نیّت میں کھوٹ ہو ہمدم
شفا کہاں کوئی اس کی دوا میں باقی ہے

نہ ہو جو عجز نہ رقّت نہ کوئی صدق و وفا
تو کوئی اثر کہاں پھر دعا میں باقی ہے

ترے بغیر ہے شمسؔ اس طرح سے بزمِ سخن
کہ جیسے رنگ نہ دستِ حنا میں باقی ہے

ندامتِ جوانی

راتوں کو رت جگے کی عادت بھی بہت تھی
عشقِ بتاں کی ہم کو علالت بھی بہت تھی

ناصح کی باتیں سننے کی رغبت بھی بہت تھی
لیکن ہمارے دل میں بغاوت بھی بہت تھی

واعظ ترے کلام سے کچھ خوش نہیں تھے ہم
بے جا کی الٹی سیدھی ملامت بھی بہت تھی

کم ظرفی تھی چناؤ میں الفاظ کے ترے
لہجے میں اسکے ساتھ جہالت بھی بہت تھی

شیطاں ہمارے دل کا قابو میں کیسے رہتا
آتش سے لبالب تھا جسارت بھی بہت تھی

خوں جوش مارتا تھا جوانی میں جب تھے ہم
بچپن کی اسکے ساتھ حماقت بھی بہت تھی

کیا وقت تھا کہ دل اک اور تھے ہزار جلوے
دل پھینکنے کی ہر سُو فرصت بھی بہت تھی

آداب سارے سیکھ گئے سجدہ رکوع کے ہم
بُت خانے کا صنم تھا کرامت بھی بہت تھی

ہر لمحہ دل تھا اپنا شکرِ خدا سے پُر
اُس بُت کی رفاقت میں برکت بھی بہت تھی

اپنی خطا پہ اتنے پشیماں نہیں تھے ہم
اِخفا پہ اُسکے گرچہ ندامت بھی بہت تھی

بے باک شمسؔ ہی سہی پر مانتے ہیں سب
کم بخت کی باتوں میں حلاوت بھی بہت تھی

ہے وہ بات ہی کچھ اور

اپنے ہاتھوں سے اگر وہ دیں تو سحر کر ڈالیں
مست آنکھوں سے پلا دیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

اُس کے انعام کو پا کے ہیں جو خوش کیا سمجھیں
رخِ روشن کو دکھا دیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

اُن سے مِلنا تو بہر کیف ہے جنّت میری
خود ہی چل کے جو آ جائیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

آہیں کافی نہیں پر شور مچا کر جو کبھی ہم
بام و در اُسکے ہلا دیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

سجدہءِ عشق میں صد بار ملا دل کو پیام
آنسو اک خُوں کا گرا دیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

فخر اور زعم ہیں کیا کفر مٹا چھوڑیں گے
پیار دستور بنا دیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

رنگ اور بُوئے چمن دل کو کرے گرویدہ
بچ اگر کانٹوں سے جائیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

رازِ دل سینہ سے نہ اب تک ہے لبِ بام آیا
خوں اگر دل کا چُھپا جائیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

ان کے انکار کی تکرار پہ دل کیوں چھوڑیں
اپنے دامن کو چھڑا لیں تو ہے وُہ بات ہی کچھ اور

کیا سناتے ہو ہمیں مجنوں کی اور قیس کی بات
قصہِ شمسؔ سُنا دیں تو ہے وہ بات ہی کچھ اور

واعظ کے نام

نہ زندگی میں کسی دل کو جیت پایا ہے
یہ فخر و زعم ہے کس بات کا۔ کیا کیا ہے؟

سوئی کے ناکے سے اونٹوں کا نہ گزر ہوگا
یہی ہے فضلِ الٰہی تو پھر سزا کیا ہے؟

وفا و عشق کی دولت کو جانچ کر دیکھو
جو دل بھی جان بھی جائے تو ماجرا کیا ہے؟

ہزار وعظ سنے دل پہ کچھ اثر نہ ہوا
تمام دنیا کو چھوڑا۔ تُو ناصحا کیا ہے؟

جہان اگلے کی باتیں سناتا ہے واعظ
ہمیں یہ فکر لگی ہے کہ یہ دنیا کیا ہے

رقیب عرصے سے ہم نے دکھوں کو جھیلا ہے
ہمارے سامنے تیرا یہ قہقہہ کیا ہے؟

بہت سنیں ہیں زمانے سے ہم نے یوں باتیں
یہ اُسکی شرم تھی ورنہ ہمیں حیا کیا ہے

ہوا ہے وصل کا وعدہ مگر نہیں ہے یقیں
جو ہوش ہی نہ رہے کیا پتہ سنا کیا ہے

ہماری سانسوں کو حاجت ہے تیری خوشبو کی
جو تیری زلفوں سے مہکی نہ ہو۔ ہوا کیا ہے

یہ آخرت ہے۔ کہاں مر گیا ہے اے واعظ
زبان بند تری خشک یہ گلا کیا ہے؟

اے شمسؔ پھر سے ہے شکوہ زبان پر تیری
تُو ادبِ عشق سے غافل تجھے ہوا کیا ہے؟

محبوب کے نام

دل کے پیغام کو میں کیسے مجسّم کر دوں
پاسباں رسموں کے بنتے ہیں زمانے والے

پیار میں چرب زبانی تمہیں بھائے نہ مجھے
ہم ہیں اشکوں سے فقط عشق نبھانے والے

جنبشِ لب کی تمنّا میں ہیں اہلِ محفل
مست آنکھوں میں ہی ہر راز چھپانے والے

راکھ کے ڈھیر سے پھلجڑ یاں نکلتی دیکھو
آگ دل میں لبِ لرزاں سے لگانے والے

گھیر لیتی ہیں خزائیں جو ذرا دُور ہو تم
مہکی زلفوں سے بہاروں کو جگانے والے

ختم ہے پیار کا احساں سے مِلانا تم پر
میری ہر ایک خطا مجھ سے چھپانے والے

کیسا انمول بدن اُسکا ہے اور پاک ہے دل
اِسی دنیا میں مجھے حُور دکھانے والے

لب کی رُخسار کی پلکوں کی ہے خوبی اپنی
نقش سب مِل کے ہیں اک جادو رچانے والے

بادِ صر صر چلے کانوں سے مچلتی جیسے
اپنی گفتار سے دل میرا لبھانے والے

عشقِ بے داغ کی ہے مجھ میں کشش ورنہ صنم
سینکڑوں ہونگے ترے ناز اٹھانے والے

اک بھرم شمسؔ کا ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا کبھی
آپ ہر پل ہیں مراساتھ نبھانے والے

متفرق شعر

رُخ کا درشن ہوا تو بعد میں ظلمت کیسی
مثلِ بجلی شبِ برسات میں آنے والے

کیوں بنائی میری فطرت کہ سجاؤں تنکے
آشیانے پہ مرے بجلی گرانے والے

اور دو چار قدم چلتے جو ہم سوئے صنم
پیچھے رہ جاتے سبھی خاک اُڑانے والے

ظلم اور احسان

اُس حُسن سراپا سے مِلا جائے تو کیونکر
اِس عشق کی مستی میں چلا جائے تو کیونکر

جو وار عدو کا تھا اُسے سہل تھا سہنا
اپنوں کا مگر وار سہا جائے تو کیونکر

جس کو نہ ہو جذبات کے دُکھنے کا کوئی غم
اُس شخص کو انسان کہا جائے تو کیونکر

پیری کا لحاظ اُس کو نہ کم سِن سے محبت
ابرار کی صف میں وہ گِنا جائے تو کیونکر

جس کو نہیں معلوم وفا کیسا ہے جوہر
عزّتِ مری اُس دل میں سماجائے تو کیونکر

تو اپنے رویّے پہ ہو خوش کچھ بھی سمجھ کر
پر ظلم کو احسان کہا جائے تو کیونکر

غیروں سے بچاؤ کی دُعا مانگ رہا ہوں
اور سوچوں کہ اپنوں سے بچا جائے تو کیونکر

اظہارِ تمنّا مَیں سلیقے سے چُھپا لوں
خود مجھ پہ اُسے رحم بھی آجائے تو کیونکر

جگ سارا کیا دشمنِ جاں جسکے سبب سے
اُس رہ سے بھٹک دل یہ مرا جائے تو کیونکر

بادل بھی ہے اور جام بھی۔ پر آپ نہیں ہیں
دُور آپ سے پھر سوچ بھلا جائے تو کیونکر

لاکھوں ہیں پُجاری ترے چرنوں میں پریتم
چِنتا ترے دل میں میری آ جائے تو کیونکر

سوچے تری دہلیز پہ ہر عرض یہ میری
منظوری ترے در پہ یہ پا جائے تو کیونکر

مِل جائے کلیسا میں بھی مندر میں بھی رب پر
بُت کعبے میں جو لے کے چلا جائے تو کیونکر

ہے شمسؔ ریا کار اداکار زمانہ
پھر اُسکی ادا مولا کو بھا جائے تو کیونکر

پردیس

ہم ہیں پردیس میں اور غم ہے نہاں پر دیسی
ہر کوئی سوچے کہ سب خوش ہیں یہاں پردیسی

شہرِ بچپن نے بھی پردیسی ہمیں جانا تھا
نئے مسکن میں ہیں تو ہم ہیں یہاں پردیسی

باسی میں کوچۂ یاراں کے دکھاؤں کیسے
غم گُساری میں کرے آہ و فغاں پردیسی

آسماں روتا ہے۔ بجلی بھی ہے تڑپے ہر سُو
آہ جب کھینچ کے ہوں نالہ کناں پردیسی

نعرۂ حُبِّ وطن لاکھ لگائیں سرِ عام
موقعہ مل جائے تو بن جائیں یہاں پردیسی

دل کہیں لگتا نہیں ایسی طبیعت ہے ملی
رہتے تھے دیس میں یہ دل تھا وہاں پردیسی

کس کو اے شمسؔ سمجھ بیٹھے ہو گھر اپنا
کوئی نہ ٹھہرے گا ہم سب ہیں یہاں پردیسی

سورج اور چاند کی جوڑی

دیکھو کہ جب بھی چہرہ میرا پُر ملال ہے
میرا نہیں ہے اُس کا بھی کچھ ایسا حال ہے

پہلے تو چُھپ چُھپا کے خبر رکھتا تھا مری
اب لوگوں کو بتاتا ہے کیا میرا حال ہے

میں نے تو اُسکا نام نہیں تھا لیا کبھی
وہ میرا ہمنوا ہے یہ سب کا خیال ہے

وہ دیکھتا ہے آئینہ آتا ہوں میں نظر
اور میرے آئینے میں اُسی کا جمال ہے

دھڑکن دلوں کی ایک ہے گو جسم ہیں جُدا
یہ بات عشق کی۔ نہ کسی کا کمال ہے

ہم جانتے ہیں دونوں ہی کچھ بھی کہے بغیر
میں اُسکا ہوں اور وُہ مرا پُرسانِ حال ہے

ہے روح کی غذا وہی اور وجہِ افتخار
سرمایہ ہے یہ میرا نہ دنیا کا مال ہے

ہے عشق میرا دنیا میں یکتا و بے نظیر
اور حُسن اُس کا ہے تو بس اپنی مثال ہے

ہم رنگ ہیں ہم دونوں ہی کچھ اسطرح سے اب
جو میرا حال ہے وُہی اسکا بھی حال ہے

اک دوسرے کے بارے میں کہتے ہیں بے گریز
''میں ماہیٔ بے آب۔ وہ مچھلی کا جال ہے''

دل میں ہے اُسکے گامزن میری وفا کی قدر
دامن چھُڑا وہ لے گا یہ خام و خیال ہے

مدّ و جزر کی طرح ہیں اک دوسرے کے ساتھ
کچھ اور دیں مثال تو شمسؔ و ہلال ہے

بڑھاپے کے عذاب

اپنی نظر میں اب نہ کسی کا شباب ہے
نہ وصل کا نہ ہجر کا اب کوئی خواب ہے

خواہش ہے جنکو ہجر کی اور وصل سے سِوا
اُن شاعروں کی شاید طبیعت خراب ہے

اب عشق کے بکھیڑوں کے قابل نہیں رہے
اب شوق کچھ نہ محفلِ رنگ و رُباب ہے

ڈر ہوتا تھا نہ جھگڑاہو بیوی سے شام کو
اِس عمُر میں نہ وقت کا کوئی حساب ہے

سَر گھومتا ہے اور پھر چلنا محال ہے
اور وجہ اسکی بھنگ نہ کوئی شراب ہے

ہر چیز دیکھتا ہوں نئے زاویے سے اب
جو موتیا تھا آنکھ میں سمجھا سراب ہے

پٹی ہو یا کہ نالہ سرکتے ہی جائے ہیں
گِر جائے کوئی چیز۔ اٹھانا عتاب ہے

گرگابی پہنتا ہوں کہ تسمے کو اب میاں
کرسی سے بیٹھے باندھنا بھی اک عذاب ہے

شادی سے اپنی میں تو وفادار ہوں بڑا
اب تھک چکا ہوں عشق بھی کرنا عتاب ہے

وہ سوچتی ہے بوڑھا ہے اب کیا کرے گا یہ
سو اُسکو چھیڑنے میں نہ کوئی حجاب ہے

سنبھالوں توند کو یا میں کندھے کروں درست
اک وقت ایسا کرنا بھی دُونا عذاب ہے

ہر مرض کی دوائیاں رکھیں ہیں پُر قطار
لگتا ہے گھر نہیں ہے یہ حکمت کی ڈھاب ہے

بیگم پڑھا بھی سکتی ہے اعلیٰ وکیل کو
مضمون اُسکا خاص سوال و جواب ہے

گلیوں میں پھرنا دھوپ میں اک جھلکی کیلئے
اب اُن حماقتوں کی نہ مُجھ میں وُہ تاب ہے

اب دُور بین چاہئے روزن نہ چل سکے
مجھ کو ضروری دیکھنا اک ماہتاب ہے

دیکھا ہے شمسؔ جاتا ہوُا اُس گلی کی سمت
واپس وہ لانا چاہتا عہدِ شباب ہے

غزل

کس جستجو سے ہر سُو گِراتے ہو تُم ہمیں
حیرت کی بات پھر بھی بناتے ہو تُم ہمیں

مانا کہ ایسی راہوں پہ تُم چل نہ پاؤگے
اے شیخ اُن سے کاہے ہٹاتے ہو تم ہمیں؟

تعریف ہو رقیب کی یا وعدہ شکنیاں
اس پہ بھی مُسکرا کے جلاتے ہو تم ہمیں

بیٹھے ہیں انتظار میں کب ہو نگے لب کشا
آنکھوں سے بات کر کے سُناتے ہو تم ہمیں

ہم کو تمہارے وعدوں کا بالکل نہیں یقیں
کیوں پھر سے وعدہ کر کے رُلاتے ہو تم ہمیں

اب اِس ادا پہ کوئی کہے بھی تو کیا کہے
وہ ہم سے جب کہیں کہ بُھلاتے ہو تم ہمیں

اک بار بالمشافہ کبھی رُوبرُو تو ہوں
کن چکّروں میں ڈال کے جاتے ہو تم ہمیں؟

ملنے پہ یاد آئی ہمیں لذّتِ فراق
قربت ہوئی جو آج رُلاتے ہو تم ہمیں

آنسو بہاتے ہو گیا اک عرصہءِ دراز
اب مسکراہٹوں سے دُکھاتے ہو تم ہمیں

یہ چاند وہ نہیں ہمیں جسکی ہے آرزُو
یہ دن میں کیسے تارے دکھاتے ہو تم ہمیں

طُوفاں بھی جھیلتے ہیں۔ ایسے دئے ہیں ہم
پھونکوں سے بیکسی میں بُجھاتے ہو تم ہمیں

کیا وارداتِ عشق ہے قصّہ یہ شمسؔ کا
جس کو بڑھا چڑھا کے سُناتے ہو تم ہمیں

غزل

ہماری ایک خواہش ہے کہ جس سے آہ بھرتے ہیں
ابھی اس دل میں جانِ من بڑے ارمان رہتے ہیں

ہمیں آتا ہے ساحل کی طرح چُپ چاپ سا رہنا
وگرنہ دل میں تھامے ہم بڑے طوفان رکھتے ہیں

اگرچہ شیخ اور واعظ کی باتیں لاکھ سُن لی ہیں
مگر پھر بھی وہی بُت اِس دِل ناداں میں بستے ہیں

گنوادی زندگی لیکن نہیں الزام اِس دل پہ
یہ تشنہ لب اُسی جامِ محبت کو ترستے ہیں

دلِ ناداں کی ڈوریں ہیں وفا و عشق کے ہاتھوں
خرد گر آگئی پھر بھی نہ کچھ ہم کر ہی سکتے ہیں

پشیمانی نہ ہو اس کو ہمارے دل کی حالت پر
نکل کر آنکھ سے آنسو یکایک پھر پلٹتے ہیں

زمانے کی ہواؤں نے ہمیں جُھلسا دیا لیکن
ابھی تک پیار سے چھلکا ہوا دل پاس رکھتے ہیں

خزاں کا ڈر تہِ دل میں رہے ہر دم تروتازہ
بہاروں میں گُلوں کے ساتھ کانٹے بھی پنپتے ہیں

تُو کس کے دل کو خوش کر دے نہیں ہے اِس کا کچھ بھی غم
وفا بدنام ہو جائے بس ہم تو اس سے ڈرتے ہیں

بروزِ حشر اِس دل کو ہے کیوں اتنی پریشانی
یہاں تو حضرتِ واعظ بھی اپنے ہاتھ مَلتے ہیں

ہمیں تو آہ و زاری میں بھی کیسا لطف آتا ہے
بہاتے ہیں اگر آنسو تو دل ہی دل میں ہنستے ہیں

ہے جس کے روبرو ہونا دھڑکتے دل کا بند ہونا
عجب ہے شمسؔ اُسکے نام پر دن رات مرتے ہیں

غزل

گرچہ چاہت کا صلہ آپ سے پایا نہ گیا
اپنا دامن بھی مگر ہم سے چھڑا یا نہ گیا

رازداں کس طرح تجھ کو اے صنم مَیں کرلوں
تیری آنکھوں سے ِمرا درد چُھپایا نہ گیا

وقت کی بھینٹ چڑھے یاد کے سارے دیپک
نقش یادوں کا مگر دل سے مٹایا نہ گیا

سُنتے آئے تھے کہ مرنے پہ ہے ملتا جیون
پھینک کر خاک میں ہم کو تو اٹھایا نہ گیا

عُمر گزری تو کُھلا راز یہ ہائے قسمت
وہ تو تیار تھے ہم سے ہی بُلا یا نہ گیا

کس سے شکوہ کریں اور کس پہ بہائیں آنسو
ساتھ تو ایک بھی ساتھی سے نبھایا نہ گیا

مختلف رنگ کی مجبوری مگر تھی با ہم
ہم چلے آئے صنم تم سے جو آیا نہ گیا

لمحہ جب آیا کہ نام اُسکا ہے لینا لازم
شمسؔ پھر قصّہِ دل ہم سے سُنایا نہ گیا

غزل

ہر اک آہٹ پہ کوئے یار میں ہم بے کراں ٹھہرے
تھے ہم مہمان پر اسکے لئے ہم میزباں ٹھہرے

چُھپایا عشق اُس کا ہم بڑے ہی رازداں ٹھہرے
مگر اُسکی نظر مجھ پہ ہی آکر بے گماں ٹھہرے

اُسی کے وصل کی خواہش کہاں رکنے ہمیں دیتی
نئ منزل اُبھر آئی جہاں ہم ناگہاں ٹھہرے

سِوا جن کے کسی پر نہ ہماری چشمِ دل ٹھہری
اب آخر میں زہے قسمت ہمی سے بدگماں ٹھہرے

طبیعت میں ہے جوگی پن یا فطرت ہے فقیرانہ
ٹھہرنا ہوتا ہے لازم یہ دل جب بھی جہاں ٹھہرے

ہم اتنے فاصلے سے گھُل رہے ہیں فکر اور غم میں
حرم سے دُور دل جن کے وہ اُسکے پاسباں ٹھہرے

کوئی بھی چاہے کہہ دے کچھ یا دُکھتی رگ کو جا چھیڑے
نظر وہ غیظ کی لیکن مجھی پہ ناگہاں ٹھہرے

تمہاری آنکھ نے کیا کیا سُنایا شمسؔ کو دیکھو
نگاہوں میں سبھی کی تم تو پھر بھی بے زباں ٹھہرے

غزل

میرے دل کی حقیقت نہیں پاؤ گے۔
بھول کر بھی نہیں اپنے گھر آؤ گے

تم کو شاید ہے خدشہ یہ دل میں ہوا
اک دفعہ آ کے پھر جانے نہ پاؤ گے

بے وفائی کی حد بھی جو چھُو لو گے تم
جانِ جاں ہم کو ثابت قدم پاؤ گے

ہم نے تیرے سہے ہیں ہزاروں ستم
اور کتنے نئے امتحاں لاؤ گے؟

کر چکی ہے ہماری محبت اثر
اب نیا ہم پہ کیسے ستم ڈھاؤ گے؟

ہونگے اب جو کبھی ہم کو درشن ترے
سوئے فتنے کئی تم جگا جاؤ گے

بے وفائی کا سودا نہ مہنگا پڑے
میرا دامن چھُڑانا گراں پاؤ گے

آنکھ ملتے ہی اُس سے اے شعلہ بیاں
مثلِ پروانہ خود تم کو سُلگاؤ گے

ہم نے ہر دم ہے چاہا تمہارا بھلا
کب تلک تُم بھلا ہم کو ٹھکراؤ گے؟

دل ہمارا جلاؤ گے تم کب تلک؟
آخر اک دن تو تم رحم فرماؤ گے
تیرا محفل میں آنا لا حاصل نہیں
جب ملے گی نظر دل کو گرماؤ گے
زندگی بے سہارا کچھ آساں نہیں
تم وفا کیش مجھ سا کہاں پاؤ گے؟
تم کو جیون ملے گا مرے عشق میں
حُسن ڈھل جائے گا تو کہاں جاؤ گے؟
کہتے ہو شمسؔ کو بے سُخن۔ دیکھنا
ایک دن گیت اُسکے ہی تم گاؤ گے

غزل

تم اپنے حُسن کی محفل سجا کے کیا کرتے
کمالِ عشق ہے۔ ورنہ یہ جلوے کیا کرتے

ہر ایک موڑ پہ دل چھوڑا اور رو بھی لئے
اٹھے تھے دیکھنے قسمت کے تارے کیا کرتے

نہ کائنات میں پایا مثالِ یار تبھی
نہ سر جھکاتے تو اسکے بجائے کیا کرتے

وصالِ یار کی تاخیر میں تھا رازِ حیات
نہ صبر کرتے تو اس کے سوائے کیا کرتے

خطا نہ ہوتی کبھی ہم سے گر تو اے جاناں
تُمہارے رحم اور احساں کے جذبے کیا کرتے

صبح کا تارہ ہے جھانکے شمع ہے گُل کب سے
اب اس انتظار کی حد سے بھی آگے کیا کرتے

تُو کیا سُنائے گا واعظ ہمیں تھی پہلے خبر
اُسی کے گھر میں ہے محفل نہ آتے کیا کرتے

ملے تو روزِ فنا اُڑ چُکے ہیں ہوش تمام
چراغِ جشن و خُوشی کیسے جلتے۔ کیا کرتے

کھلا ہے شمسؔ کا دل یار کی رفاقت سے
بغیر خضر کے سینا کے جلوے کیا کرتے

غزل

پھر سے اک سانس لیا یاد تری آئی ہے
آگ پھر سینے میں احساس نے سلگائی ہے

آ بھی جا تو میری جاں۔ جان پہ بن آئی ہے
اے مسیحا۔یہ ترا فرضِ مسیحائی ہے

یہ تو ممکن ہی نہیں شکوہ کریں ہم تم سے
ہم نے احساس کے بدلے کی قسم کھائی ہے

اُس کے بارے میں سُنیں شوق ہے راہگیروں سے
ورنہ مدّت سے مِری اُس سے شناسائی ہے

ذائقہ دل سے خزاں کا نہیں جاتا اب تک
اب کے اِس رنگ سے گلشن میں بہار آئی ہے

صید اک دانے پہ یوں دام میں کب آنا تھا
یہ تو صیاد کی ہی حوصلہ افزائی ہے

ایک ہی جام تھا مانگا تو قیامت اٹھی
اب رقیبوں کی زبوں حالی سمجھ آئی ہے

ایسی تاثیر بھی دیکھی ہے کسی بادل میں
جیسے رخ پہ تیرے گیسو کی گھٹا چھائی ہے

پھول ہی پھول نکھر اُٹھے،ہوں گلشن میں کئی
ایک چہرے کی یہ رنگت سے بہار آئی ہے

عدُو بنانا نہیں تھا سرشت میں میری
ضرور شمسؔ یہ اپنوں کی کارروائی ہے

غزل

دھڑکنا تیزی سے دل کا یوں خواہ مخواہ تو نہیں
ہمارے کوچے میں آیا وہ دلربا تو نہیں؟
بلایا شوق سے اتنا مگر ہے دھڑکا لگا
میرے اثاثۂِ دعوت میں کچھ رہا تو نہیں؟
وہ مسکرائے رقیبوں سے تو مجھے یہ لگا
یہ میرے صبر کا عزموں کا امتحاں تو نہیں؟
ہماری فطرتِ الفت کا یہ تقاضا ہے
گرے ہیں عشق میں۔ ورنہ یہ مسئلہ تو نہیں
جھٹک کے رخ کو ہے پھیرا جو ہم سے جاتے ہوئے
یہ ناز و نخرہ ہے صاحب وہ بے وفا تو نہیں
ہنسی نے اُسکی پریشاں کیا ہے کیسے مجھے
وہ راضی پیار پہ یا طنزِ بر َملا تو نہیں؟
گیا حرم میں تو آئی مجھےِ وہاں یہ صدا
یہ جائے عشق ہے۔ جنّت کی تجھ کو چاہ تو نہیں؟
ہرایک سانس کی بنیاد پر تری خواہش
وگرنہ دنیا یہ رہنے کی کوئی جا تو نہیں
گرجتے کیوں ہیں یہ بادل چمکتی ہے بجلی؟
یہ جائے گزر ہے میرا قیام گاہ تو نہیں

خموشی اُسکی اٹھائے خیال دل میں مرے
وہ میری یاد میں بھی کھویا کھویا سا تو نہیں؟

پڑا ہے شوقِ زیارت تو کیا پشیمانی
یہ زندگی میں مِری پہلا ابتلا تو نہیں

ستم اٹھائے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا
جوان دل ہے ابھی گو یہ چُلبلا تو نہیں

جو چاہے اُٹھا ہؤا تیر آزما ہم پر
یہ قلبِ شمسؔ ہے کوئی ہدف کی جا تو نہیں

غزل

گر نہیں کوئی تعلق مجھ سے شرماتے ہیں کیوں؟
باتوں ہی باتوں میں میرا نام بھی لاتے ہیں کیوں؟

جب ارادہ کرتا ہوں ظاہر میں ترکِ عشق کا
کیسے گھبرا کر یکایک مجھ سے فرماتے ہیں: کیوں؟

کتنا عرصہ ہوگیا عاشق ہوئے ناکامیاب
آج بھی وہ حُسن کے جالوں میں پھنس جاتے ہیں کیوں؟

مِٹ گئے ہم جن کی خاطر بے وفا نکلے سبھی
اُن سے اُمّیدِ وفا اِس دل میں ہم پاتے ہیں کیوں؟

ناصحا میں کیا کہوں کہ تُو سمجھ سکتا نہیں
عشق کی راہوں میں عاشق خود کو تڑپاتے ہیں کیوں؟

گرچہ اب تک ہے وہ ہم سے بے نیاز و بے رحم
نام سُن کر اُس کا پھر یکدم سکوں پاتے ہیں کیوں؟

ناز کرتے ہیں کہ ہم ہیں عشق میں ثابت قدم
جا کے پھر اُس کی گلی سے ہم پلٹ آتے ہیں کیوں؟

کہتے ہیں کہ جاؤ اب کافی ہے بس اتنا سفر
ہاتھ میرا پھر پکڑ کر اس کو سہلاتے ہیں کیوں؟

ہم کو سب ہے علم عشقِ ناروا کے کھیل کا
پھر بھی ہر بازی کو ہم یوں ہارتے جاتے ہیں کیوں؟

مدّعا ہے اُن کا جو بھی سامنے آ کر کہیں
اپنی نظروں سے اداؤں سے وہ بہلاتے ہیں کیوں؟

گر نہیں وہ چاہتے ہم سے ملاقاتیں طویل
جانے وہ پھر ہر بہانے بات لٹکاتے ہیں کیوں؟

کش مکش میں ہوں کہ جن کو کچھ نہیں پروا مِری
قاصدوں سے بار ہا خط میرے پڑھواتے ہیں کیوں؟

خود جو پا سکتے نہیں میری سُبک رفتار کو
سنگریزے میرے رستے میں وہ بکھراتے ہیں کیوں؟

ان کو ہے ارمان اپنی خُوبیءِ گفتار پر
بات کرتے مجھ سے پھر وہ شمسؔ گھبراتے ہیں کیوں؟

غزل

وجہ ہے ساری کمالاتِ خوبیٔ جاناں
جو اک حیات تھی اُسکو بھی تو لُٹایا ہے

سما سکا نہ غموں کا اندھیر اس دل میں
درو دیوار پہ بھی اب تو غم کا سایہ ہے

بہار آئی ہے کلیوں پہ چھائی ہے مستی
دلوں کے تار چھڑے پھر وہ یاد آیا ہے

چلا گیا ہے مگر اُسکی یاد کا سایہ
مٹے گا کیسے جسے مشکلوں سے پایا ہے

ہمارے آنسو نکل آئے اُسکی آنکھوں سے
نصیب اپنے کا قصّہ جسے سنایا ہے

رقیب کونے میں بیٹھا ہے سر کئے نیچا
نہ اسکی عقل میں طورِ وقار آیا ہے

قریبِ مرگ ہوں کچھ تو خیال کر لیتا
اے نامہ بر مجھے تُو نے یہ کیا سنایا ہے

کسی کا ٹوٹا دل دیکھنے کی کب ہے سکت
صیّاد تیرے لئے خود شکار آیا ہے

تو غیر پہ ہے مہرباں مگر ہمارے لئے
کبھی تو درد کبھی غم کا جام لایا ہے

جو چاہے ظلم کرے تیرا در نہ چھوڑیں گے
اسی بھروسے پہ تُو نے ہمیں ستایا ہے

ہر ایک دن میرا گزرا ترے تصوّر میں
تمام رات بمثلِ شمع جلایا ہے

فراخی دل کی تمہاری نہ کر سکے جادو
یہ ڈھونگ شکوے کا اے مہرباں رچایا ہے

کہیں بھی اور نہیں شمسؔ مے کدہ ایسا
خودی کو کھویا تو کیسا سرور پایا ہے

غزل

دلِ خراب نے خود کو بھُلایا ہے کب سے
ہمارے دل میں محبّت کا رونا ہے کب سے

بہار آئی ہے پھولوں کو بھُول جائے گا
خزاں کے دور میں کانٹوں نے کاٹا ہے کب سے

بجھ دِکھا کے رہیں گے چراغاں ہر صورت
نہیں ہے غم کہ یہ بادل ہیں چھا رہے کب سے

عجب ہے دیکھو یہ پروانے کیسے اندھے ہیں
محبّتوں کے دیئے جگمگا رہے کب سے

نثار کردو خودی کو تو پھر یہ ظاہر ہو
بُجھی وہ آگ تھے جس کو جلا رہے کب سے

اگر وہ اب بھی ملے۔ ہے یہ اُسکی دلداری
بحث نہیں کہ وہ دل تھے دُکھا رہے کب سے

کسی کو علم نہیں اپنے عشق کی شدّت
کہ ہم سے مجنوں بھی ہیں مات کھا رہے کب سے

پہاڑ طے کئے وہ بھی بغیر تیشے کے
ہیں خالی ہاتھ فتح ان پہ پا رہے کب سے

ہزار جتن کئے پر زبان کُھل نہ سکے
غبار دل کا ہمی ہیں چھُپا رہے کب سے

ہمارے آنسو نے پلٹا ہے تختہ ورنہ ہم
بجا ہم عشق میں سجدے تھے لا رہے کب سے

بُرا ہو دل کا جو کرتا رہا عدُو پہ یقیں
ہم اُس کی باتوں پہ دھوکا تھا کھا رہے کب سے

دِکھاتا آنکھیں ہے پیرِ مغاں تو کیا پروا
تھے نین ساقی کے ہم کو پلا رہے کب سے

زباں دبانے پہ اتنا نہ ناز کر بے جا
ہمارے راز کو وہ ہیں چُھپا رہے کب سے

دِلوں کی بات ہے عاقل ہوا ہے دیوانہ
کہ شمس آگ کے منہ میں ہیں جا رہے کب سے

غزل

کہاں سے بات چلی تھی کہاں پہ آ ٹھہری
تمہارے لب سے چلی تھی کلی پہ جا ٹھہری

حسین اور بھی ہیں پر یہ امتزاجِ نقوش
ہماری آنکھ اِسی معجزے پہ جا ٹھہری

تائیدِ یزداں ملی مُجھ کو اُس پری وش سے
خُدا کی حُسن تراشی کی وہ گواہ ٹھہری

ہمیں وفا کی ہے اُمید دے کے دل اُس کو
وجہ نہ اور تھی بس اُس کی اک نگاہ ٹھہری

بہانے لاکھ تھے اُسکو اٹھاتے پردۂ رُخ
ہماری ایک ہی دشمن تھی وہ حیا ٹھہری

اٹھائی اس نے نظر یوں خمار سے بوجھل
وُہ سیدھی دل پہ لگی اور نہ جا بجا ٹھہری

چلا کے بات کوئی ہم نے سوچا ہی نہ کبھی
وہ کس کے دل کو لگی اور کہاں پہ جا ٹھہری

یہ کیسی بات ہے- چُپ یار بھی عدُو بھی ہے
وہ کس نے کی تھی شروع۔ ملزمہ ہوا ٹھہری

تمہاری بات کے بارے میں شمسؔ ہم کیا کہیں
نہیں تھی کچھ بھی مگر پر اُثر ندا ٹھہری

غزل

اِس ہاتھ سے لیا جو وہ عام دے دیا ہے
ہو کے خُدا کی رَہ میں گمنام دے دیا ہے

کچھ اس طرح ہی اپنی گزری ہے عمُر ساری
جو بھی لیا کسی سے سرِ عام دے دیا ہے

ترے دعویٰ فراخی سے ہم کو کیا ہے لینا
چلتے ہوئے جو راہ میں اک دام دے دیا ہے

کشتیِ مری کے ملنے کی دیر تھی خُدایا
طوفاں کو حکم اُس نے ہر گام دے دیا ہے

کتنا تھاسوز ساقی میری التجا میں دیکھو
پیرِ مغاں نے بڑھ کے خود جام دے دیا ہے

اب کچھ نہیں ہے حاجت تو جام بھر دے ساقی
تیری آنکھ نے تو ہم کو انعام دے دیا ہے

جس ناخدا کا ڈر تھا اور پوجتے رہے ہم
روزِ جزا میں ہم نے ترا نام دے دیا ہے

یہ وہ بھی جانتا ہے ثابت نہ جُرم ہوگا
کیوں اُس نے پھر بھی ہم کو الزام دے دیا ہے

الفاظ کیسے لاتے مضموں جنہیں بناتے
آنکھوں نے ایسے لمحے کیا کام دے دیا ہے

سمجھے تھے شمسؔ ہم تو دعوت ہے خاص ہم کو
سُنتے ہیں اُس نے سب کو پیغام دے دیا ہے

غزل

ہوئے جو روبروئے حُسن جانے کیا ہوگا
ہماری خُو بھی قیامت ہی ڈھانے والی ہے

ابھی دماغ ہی کھویا ہے جسکی مہکوں سے
وہ زُلف دل پہ گرہ بھی لگانے والی ہے

نہ اتنی جلدی سے ٹھکراؤ میری چاہت کو
تمہارے حُسن کی قسمت جگانے والی ہے

قضا کو ٹال دیا ہم نے اِس تمنّا سے
خبر ہماری اب اُس تک پہنچنے والی ہے

ہمیں نہیں ہے کوئی فکر سونے کی مانند
تپش یہ عشق کی کندن بنانے والی ہے

ستم ہزار اٹھائے۔ مگر سلامت ہے
یہ جاں اُسی کے دریچے پہ جانے والی ہے

ہر اک وبا سے گزرنے پہ جانا یہ ہم نے
کہ آفت اور کوئی ہم پہ چھانے والی ہے

یہ حوصلہ ہے مرا چُپ ہوں ورنہ سوچو تو
ہر ایک بات تری شکوہ لانے والی ہے

نہ دِر سے اُس کے اُٹھو شمسؔ دو گھڑی ٹھہرو
دُعا تمہاری بس اب رنگ لانے والی ہے

غزل

ہمارے پہلو وہ بیتاب ہو کے آ بیٹھے
ہم اس جہاں میں نیا اک جہاں بسا بیٹھے

ہم ایسے گم ہوئے اپنے فسانۂِ غم میں
شروع کہاں ہوا کب ختم سب بُھلا بیٹھے

گمان کب تھا کہ بلبل کرے گی آہ و فغاں
یہ کس کو اپنا فسانۂِ دل سُنا بیٹھے

کسی سے چُھٹ گئی دنیا کسی سے ملکِ عدم
ہم اپنے پیار میں دونوں جہاں گنوا بیٹھے

سبب تھا لذّتِ ہجراں کہ چھوڑے سب اسباب
ہمارے جیسے کئی منزلوں پہ جا بیٹھے

اے چارہ گر انہیں تُو کیا تسلّیاں دے گا
دل و دماغ جو اِس راہ میں گنوا بیٹھے

نظر میں اپنی کوئی راہنما جچا ہی نہیں
تھے کتنے کارواں ہم جن کو آزما بیٹھے

تو راہِ عشق میں بڑھنے سے روکے ہے واعظ
جب اِس محاذ میں ہم کشتیاں جلا بیٹھے

فروغ عشق کو مِل جائے گا اُسی لمحہ
جب اس جہان کی رسموں سے جاں چھڑا بیٹھے

امیّدِ چشمِ کرم دل پہ ثبت ہے ایسے
ہزار بار اُٹھے۔ پھر وہیں پہ جا بیٹھے

ملے ہیں خاک میں وہ زُعم سب دلیری کے
نگاہِ ناز سے آنکھیں جو ہم لڑا بیٹھے

فقط یہ وصل کی امید ہی نہیں دلبر
کہ زندگی کا بھی مقصد تمہیں بنا بیٹھے

کسی رفیق سے شکوہ بھی تھا خلافِ طبع
ہر ایک بات پہ اپنا ہی دل جلا بیٹھے

وفا تمہاری ہی اے شمسؔ بارور ہو گی
بجز تم اُس کے تمنائیں سب مٹا بیٹھے

غزل

آ بھی جاؤ کہ جی نہیں لگتا
نہ ستاؤ کہ جی نہیں لگتا

تلخیاں ہیں حقیقتوں میں بہت
کچھ پلاؤ۔ کہ جی نہیں لگتا

ایک ارماں ہے تُو کہے مجھ سے
مسکراؤ۔ کہ جی نہیں لگتا

نہ برائی کرو زمانے کی
نہ بتاؤ۔ کہ جی نہیں لگتا

اونچی پرواز کیا ہے۔ بے پر کی
نہ اڑاؤ۔ کہ جی نہیں لگتا

پھیر لی آنکھیں ساقی نے اس کو
نہ بُلاؤ۔ کہ جی نہیں لگتا

دِوستوں دشمنوں سے کیا شکوہ
تم بھی جاؤ۔ کہ جی نہیں لگتا

نہ سہی سُکھ تو کچھ تو ہو یارو
اب ستاؤ۔ کہ جی نہیں لگتا

شمسؔ پہلے دُکھی ہے اب اس کو
نہ بناؤ۔ کہ جی نہیں لگتا

★★★

اونچی پرواز کی نہیں ہمّت
آشیانے میں جی نہیں لگتا

دشمنوں سے بھی کیا کریں شکوہ
دوستانے میں جی نہیں لگتا

دل کے ہاتھوں یہ حالِ زار ہوا
دل لگانے میں جی نہیں لگتا

تجھ سے کچھ دشمنی نہیں واعظ
اب زمانے میں جی نہیں لگتا

پنجابی غزل

پتہ نہیں لگا کِتھّے گئی اے
جندڑی چھیتی مکدی پئی اے

مِٹھّے بُل تے۔ جسم وی سوہنا
شاعراوہدی اکھ دا نشئی اے

بیوی دے نال اے روز لڑائی
منان دی مینوں عادت پئی اے

میری ہر گل عقل مطابق
کُش گلّاں وچ اوہ وی صحیح اے

دوجی بیوی ۔ کی بئی کہنا
حسرت سب دے دلِ وچ رئی اے

اودھے ماں پیو دوویں سوہنے
خورے کس دے اُتےّ گئی اے

قمیض دوپٹہ چادر ہنُ تے
پردہ نئیں سب فیشن لئی اے

شوگر کسراں تھلّے ہو وے
سامنے لڈّو۔ برفی پئی اے

گھر وِچ اج کل چُپ چُپاتا
لگدا اے بیگم پیکے گئی اے

اگلی دُنیا ویکھاں گے ہُن
ایہہ دنیا تے دوزخ جئی اے

شوق اے جنّت ویکھئیے پر بھئی
ایڈی وی کیہڑی کاہلی پئی اے

پنگا لین تو رُکدا نئیں اوہ
ہر گل پانوے پُٹھّی پئی اے

اوہنوں اے تقریر دا چسکا
ساڈی جندڑی پھائے پئی اے

بُڈّھے وارے عشق نئیں چھڈدا
کمر نہ پانوے سِدّھی رئی اے

اگلی گل نوں کی اوہ سُنا ندا
پہلی گل تے مار جو پئی اے

ہنسدی کیوں اے۔ جدوں میں کہناں
''میرا سب کچھ تیرے لئی اے''

ربّا کدی تے اَسی وی کہئیے
بحث وِچ بیگم ہار گئی اے

عشق توں روکن والیو سن لو
گل اے ہتھوّں نکل گئی اے

جان بچان نوں لُک دا پھرناں
تہانوں جِت تے ہار دی پئی اے

اپنے تک سنبھال کے رکھنا
گل جیڑی میں تُہانوں کئی اے

سوال تے بیگم دے میں سوچاں
جواب پتہ نئیں کیہڑا صحیح اے

شمسؔ کسے نیں گل اوہدی کیتی
ساہڈے گھر ہُن آفت پئی اے

کچھ اپنی زبان میں

شعر و سخن سے دلچسپی مجھے بچپن سے تھی۔ اور سکول و کالج کے ادبی ماحول نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ سکول اور کالج میں دورانِ تعلیم ہفتہ میں کم از کوئی ایسی تقریب ہو جاتی۔ جس میں شعر و ادب کا ذوق اجاگر ہوتا۔ اسی فضا میں مجھے بھی اپنے سخن وری کے ذوق کو پروان چڑھانے کا شوق پیدا ہوا۔ پہلے تو میں اپنے دوستوں اور دیگر مشہور شاعروں کے کلام سے اپنے اس ادبی ذوق کو تسکین دیتا رہا۔ عمدہ شعر کاپی پر نوٹ کرتا اور پھر تنہائی میں اسے گنگناتا رہتا۔ ایک عمر تک مزاحیہ اشعار سے زیادہ لطف اندوز ہوتا رہا۔ اور جب اس نوعمری سے شباب کی جانب بڑھا تو رومانوی اور معرفت آمیز شاعری کے قریب ہوتا چلا گیا۔

پھر خود بھی شعر کہنے لگا۔ لیکن انہیں اپنے تک محدود رکھتا لیکن جب سمجھا کہ اپنی سخنوری کو دوسروں تک پہنچانا چاہیے تو ایک دو دوستوں کو اپنی کاوشوں سے مستفیض کرنے لگا۔ مبارک عابدؔ اس زمانے میں بھی دورانِ تعلیم شعر سنایا کرتا۔ بلکہ سکول اور کالج میں ترنم سے گایا کرتا تھا۔ وہ سکول میں میرا اہم جماعت بلکہ سیٹ فیلو بھی تھا۔ اس سے اپنی شاعری پر تبادلہءِ خیالات کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ شعر و سخن گوئی کا سفر جاری رہا۔ امریکہ میں رہ کر بھی اپنے اس ذوق کی آبیاری کرتا رہتا ہوں۔ اس کے پھل پھول آپ کے سامنے ہیں ان سے فیض یاب ہوں۔ الفاظ سے بھی معانی سے بھی۔

خیر اندیش

فلاح الدین شمس